سفرِ مصر

مصری ثقافت.....عادات واطوار

ایک روز ہم وزارت تعلیم کے پریس کے سامنے کھڑے تھے جہاں ٹرکوں کی لمبی لمبی لائنیں لگی تھیں اور یہ سب مختلف مراحل کے کورسز کی کتابیں لینے آئے تھے، مصر میں سرکاری اسکولوں کے بچوں کے لئے نصاب کی کتابیں شائع کرنا اور تقسیم کرنا اسی وزارت کے ذمہ ہے جسے ہمارے ہاں وزارت تعلیم اور یہاں تربیہ کہا جاتا ہے۔ٹرکوں کے ڈرائیور گاڑیاں پھنسانے کے ایسے ہی ماہر لگتے تھے جیسے ہمارے ہاں کے ڈرائیور، جو حال ہم نے کراچی میں جوڑیا بازار کے رش کا دیکھا تھا وہی منظر یہاں نظر آ رہا تھا۔ٹرک، ٹرالیاں، ہاتھوں سے دھکیلی جانے والی ریڑھیاں اور ٹھیلے، اور گدھا گاڑیاں۔ان سب کے، ڈرائیور، کوچ یا ساربان سب ایسے ہی تھے جیسے ہمارے خالص پنجاب کے ہوتے ہیں۔ان کے مابین آپ جناب نام کی کوئی زبان نہیں تھی۔کھڑی زبان، اور اس میں علاقائی موٹی موٹی گالیاں بالکل پنجابی اسٹائل کی۔جن سے یہ ٹرک ڈرائیور حضرات ایک دوسرے کو نواز رہے تھے۔پھر اچانک ایک شور بلند ہوا اور ایک لحیم شحیم شخص نے ٹرک سے ایک سریا نما چیز نکالی اور دوسرے کے سر پہ دے ماری۔خون کا فوارہ پھوٹ پڑا مگر وہ زخمی شخص اس کی پروا کئے بغیر اس کی جانب لپکا اور اسے ٹانگوں کے بیچ سے پکڑ کر گھسیٹ لیا، قریب تھا کہ اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے اور اسے جان ہی سے مار ڈالے کہ نوجوانوں کے اک غول نے اس پر حملہ کر دیا اور اٹھا کر ایک ٹرک میں یوں پھینکا جیسے کچرا دان میں کوئی چیز پھینکتے ہیں۔وزارت تعلیم کے ایک دفتر میں ہمیں بھی ایک صاحب سے ملنا تھا اور سلیبس کے حصول کی بات کرنا تھی مگر ایک تو اس خوفناک منظر نے ہمارے حوصلے پست کر دئے دوسرے اس بابو نے بڑی معصومیت سے کہا الدنیا حر، یا شیخ (یعنی آج دن گرم ہے).....اور اس کے ساتھی نے مخصوص روایتی انداز میں کہا تعال بکرہ یابیہ ..... اور ہم بھی گرمی کی شدت کے باعث اپنا پروگرام ملتوی کر کے چلے آئے کہ ..... خلی ولی بکرہ ھا نشوف.....

مصر کی آبادی 82.54 ملین نفوس پر مشتمل ہے جس کا ساٹھ فی صد حصہ دیہات میں آباد جبکہ تقریباً چالیس فی صد شہروں پر مشتمل ہے۔اس میں غالب اکثریت (۸۰ سے ۹۰ فی صد) مسلمانوں

کی ہے جبکہ دیگر مذاہب میں عیسائیت کل آبادی کا ۱۵ سے ۲۰ فی صد ہے۔ علاوہ ازیں کچھ یہودی اور دیگر مذاہب کے لوگ بھی ہیں مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ مقامی کرنسی کو انگریزی میں پاؤنڈ جبکہ مقامی عربی میں جنیہ کہتے ہیں۔ اور چونکہ مصری ج کو اس طرح ادا کرتے ہیں جیسے ہم گاف پڑھتے ہوں، تو یہ جنیہ ان کی بولی میں گنیہ ہے لکھنے میں جنیہ ہے۔ چنانچہ یہ لطیفہ مشہور ہے کہ مصری جنت (جنہ) کو گنہ (گنا) کہتے ہیں۔ چنانچہ مکہ مکرمہ کے ایک سفر میں (جس کا حال ان شاء اللہ آئندہ کسی وقت تفصیلاً پیش کیا جائے گا) ایک دوست نے ہمیں لطیفہ سنایا کہ ایک مصری غلاف کعبہ سے لپٹ کر رو رو کر بآواز بلند کہہ رہا تھا۔ اللھم انی اسئلک الگنه (الجنة) ایک پنجابی نے اسے دیر تک روتے اور یوں دعاء کرتے دیکھا تو دونوں کندھوں سے پکڑ کر پیچھے ہٹایا اور کہا اتنی دیر سے دیکھ رہا ہوں تم اللہ سے گنا مانگ رہے ہو۔ یہ بھی کوئی مانگنے کی شئی ہے۔ آؤ میں تمہیں اپنے کھیتوں کے گنے بھجوادوں گا۔

شہروں میں دو طرح کے لوگ ہیں ایک تو پینٹ بابو جو زیادہ تر ملازم پیشہ ہیں۔ دوسرے برگر کلاس کے.....مگر تعداد کے اعتبار سے اول الذکر زیادہ ہیں۔ بہت کم ہیں جو اب بھی مصر کا روایتی لباس (جبہ) جسے یہاں جلابیہ کہا جاتا ہے پہنتے ہوں۔ اور ان میں بھی ادھیڑ عمر ہے ہیں، نوجوانوں میں جبے کا رواج ختم ہو چکا ہے تاہم دیہاتی علاقوں میں اکثر عربی/افریقی لباس پہنا جاتا ہے۔ مرد وخواتین سبھی عامی عربی (Clocial) بولتے ہیں بعض شہری نوجوانوں کو انگریزی کو منہ مارتے بھی دیکھا مگر ان کی انگریزی اسی وقت حرکت میں آتی ہے جب کسی اجنبی (غیر ملکی) کو دیکھ لیں۔ تاہم برگر کلاس کا حال وہی ہے جو اپنے یہاں کی برگر کلاس کا ''کہ نہ شتر نہ مرغ۔''

جامعہ الازہر کے بعض اساتذہ اس نئی نسل سے اتنے ہی بیزار ہیں جتنے کہ نئی نسل والے ان سے، بعض علماء تو اس نئی نسل کے شدید مخالف ہیں اور انہیں اولاد کفر بتاتے ہیں، اور کیوں نہ ہوں کہ یہ نئی نسل بھی تو علماء کے وجود کو برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ ہمیں اس شدت ونفرت کا سبب تلاش کرنے میں دیر نہیں لگی کہ شادی کی ایک مجلس میں جو ایک کلب میں منعقد تھی اکثریت برگریوں کی تھی اور وہ برملا کہتے تھے کہ یہ ملا ہمیں کچھ کرنے ہی نہیں دیتے کوئی دوست دوست کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلے تو انہیں تکلیف، کلب میں کچھ اچھل کود (رقص) کرنا چاہیں تو انہیں ناگوار، کہیں آب مقطر (شراب) کا جام نظر آجائے تو فسق کا فتویٰ اور اگر کوئی حوا کی بیٹی ذرا سا جالی دار اجلا کپڑا پہن کر اپنے بدن کو ذرا سی ٹھنڈک پہنچا لے تو وہ انہیں بے لباس نظر آنے لگتی ہے اور اس پر کفر کا فتویٰ ''کہ یہ لباس کافرانہ ہے'' اب بھلا بتائیں

اس دور میں یہ ملا لوگ پرانے زمانے کی باتیں کرتے ہیں۔اور لباس سے لے کر بالوں کی تراش خراش تک پر پابندی لگاتے ہیں۔انہیں کم از کم اس دور میں پیدا نہیں ہونا چاہئے تھا۔جس کے تقاضوں کو یہ سمجھنے سے عاری ہیں۔(نقل کفر کفر نہ باشد) یہ باتیں ان جوانوں نے ہمارے ساتھ موجود ایک ازہری استاذ سے کہیں جو سفاری سوٹ میں ملبوس کلین شیو اور ''مہذب'' لگتے تھے۔اور ہم سے وہ وقفے وقفے سے اپنی اس طلاقت لسانی پر (عفوایا شیخ کہہ کر) معذرت کرتے جاتے تھے۔

کچھ یہی حال ادھر ہمارے ملک میں بھی اس کلاس کا ہے۔پئیں گے تو بائیں ہاتھ سے، کھائیں گے تو لازمی طور پر کھڑے ہو کر۔پیشاب بیٹھ کر کرنا ان کی پینٹ کی توہین ہے۔اور کھانے سے پہلے یا بعد میں ہاتھ دھونا ان کے نزدیک دقیانوسیت ہے۔ٹشو سے جب استنجا سمیت سارے کام چل جاتے ہیں تو پانی کے استعمال کا تکلف آخر کیوں.....؟

ایک روز ہم مزارات کی زیارات کے ارادے سے نکلے تو ہمارے ساتھی نوجوان (احمد مصطفیٰ) نے پینٹ کوٹ کی بجائے جبہ پہن لیا۔ہم نے کہا آج تو آپ مصری لگ رہے ہیں کہنے لگا ہاں مصری نہیں صعیدی۔ہم نے کہا وہ کیسے کہنے لگا مصر تو اب قاہرہ کو کہتے ہیں۔اور قاہرہ والوں کا لباس ماڈرن ہے۔یہ لباس (جلابیہ/گلابیہ) تو ہمارے صعید مصر میں پہنا جاتا ہے۔صعید مصر، مصر کا خالص دیہاتی علاقہ ہے جہاں کے لوگ ٹھیٹھ دیہاتی مصری زبان بولتے اور خالص مصری ثقافت کے علم بردار ہوتے ہیں ایسے لوگوں کو ہمارے ہاں پینڈو (دیہاتی) کہا جاتا ہے۔مصریوں کے ہاں جتنے لطائف ہیں ان کا منبع ومصدر صعیدیوں کو بتایا جاتا یا ان کا اطلاق صعیدیوں پر کیا جاتا ہے۔جب بھی کوئی مصری لطیفہ سنائے گا تو کہے گا کہ ایک صعیدی تھا۔جس نے یوں یوں کہا یا کیا۔لیبیا میں ترہون کے علاقے کے لوگوں کی طرف لطائف کی نسبت کی جاتی ہے کہ ایک ترہونی نے یہ کہا۔ہندوستان میں سکھوں، پاکستان میں، کراچی میں خان صاحبوں اور پنجاب میں جولاہوں کے لطیفے مشہور ہیں۔صعید مصر کا ذکر آیا تو وہ لطیفہ بھی سنتے چلئے جو ہمیں ہمارے ساتھی احمد مصطفیٰ نے سنایا حالانکہ وہ خود صعیدی ہیں۔کہنے لگے ایک صعیدی ایک دیوار میں سوراخ کرنے کے لئے کیل ٹھونکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کیل نصف سے زیادہ دیوار میں نہیں جا رہی تھی جب وہ تھوڑے برسا برسا کر تھک گیا تو اسے خیال آیا کہ دیوار کی دوسری جانب جا کر دیکھوں کہ آخر سوراخ کیوں نہیں ہو رہا۔ادھر جا کر دیکھا تو ایک صعیدی دیوار کے عین اسی جگہ اپنا سر جمائے کھڑا تھا۔

ہم باتیں کرتے کرتے ایک جگہ رکے تو سامنے ایک مزار شریف تھا، احمد نے گاڑی پارک کی

اور ہمیں بتایا گیا کہ یہ سیدہ زینب (رضی اللہ عنہا) کا مزار ہے۔ ہم نے کہا۔ سیدہ زینب؟ یہاں کہاں سیدہ زینب۔ ان کا مزار تو کہیں شام میں ہم نے دیکھا اور زیارت کی تھی۔ جی ہاں! مگر یہ مزار بھی سیدہ زینب ہی کا ہے۔ کون سیدہ زینب؟ حضور ﷺ کی وہ نواسی، سیدنا علی المرتضی کی وہ صاحبزادی جو میدان کرب و بلا میں حضرت حسین کے ساتھ شریک سفر تھیں۔ اور جن کی زبانی کربلا کی ساری داستان بحیثیت عینی شاہد روایت کی جاتی ہے۔ مزار پر موجود مجاورین کے انداز ہمارے لئے کچھ نئے نہیں تھے کہ مصر اور پاکستان کی مذہبی وثقافتی ہم آہنگی کے مناظر ہم پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ اسی طرح ہاروں کی دکانیں، اگربتیوں کی مخصوص خوشبو، چراغ اور موم بتیاں، کالے پیلے ہرے نیلے جھنڈے اور بے ہنگم بالوں والے ملنگ اور ملنگنیاں سب کچھ اپنا اپنا سا لگ رہا تھا، کچھ واجبی سے لباسوں میں ملبوس، اپر کلاس کی ناگوار سی صورتیں بھی ادھر نظر آئیں جیسی اکثر سیر گاہوں، تفریحی مقامات یا آباد ساحلی علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ کچھ لوگ ان کے اردگرد جمع ہیں اور انہیں حیرت سے تک رہے ہیں لیکن ہمیں ان لوگوں سے کیا غرض ہم تو آئے ہیں زیارت کو۔ اور زیارت مزارِ سیدہ زینب اس طرح ہو رہی ہے کہ آنکھوں کے سامنے دمشق میں موجود مزار شریف کی تصویر بھی ہے اور نگاہوں میں کرب و بلا کے میدان کا نقشہ بھی۔ آپ کو بطلۂ کربلا کہا گیا کہ جواں مردی کی جو داستان آپ نے رقم کی ہے خواتین کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ہمیں بتایا گیا کہ ۶۱ ہجری میں یہ ایک مختصر سے قافلہ کے ساتھ مصر آ گئی تھیں جہاں والی مصر مخلد الانصاری نے بساتین الزہری میں ٹھہرایا تھا۔ یہیں آپ کا مزار مبارک ہے۔ مصری لوگ شامیوں کی بات نہیں مانتے اور اسی مزار کو اصل قرار دیتے ہیں۔ جبکہ شامیوں کا کہنا ہے کہ مزار تو وہی ہے جو دمشق میں ہے۔ مختلف سفرناموں میں ایک روایت امام عبدالوہاب شعرانی کے توسط سے مذکور ہے جس سے اس مزار (مصر والے) کا اصل ہونا ثابت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ہم نے مزار شریف کے باہر ہی کھڑے رہ کر فاتحہ و دعاء کی کہ حرم آل نبی کے احترام کے پیش نظر اندر جانے کی ہمت و جرأت نہ ہو سکی۔ تاہم لوگوں کا ایک ہجوم اندر باہر جا آ رہا تھا اور ایک طرف سے خواتین کے لئے جانے کا راستہ مخصوص تھا۔ یہاں لوگ اس مزار کو فیض رساں بتاتے ہیں اور خواتین تو بطورِ خاص اپنی مشکلات کے حل کے لئے اسے اکسیر خیال کرتی ہیں۔ اور یہاں اپنے اور سیدہ زینب کے رب سے وہ کچھ طلب کرتی ہیں جو ان کے من میں آتا ہے۔ یہ محلہ سیدہ زینب کے نام پر مشہور ہے اسے حی سیدہ زینب کہا جاتا ہے۔

یہاں سے فارغ ہوکر ہم میدان ابن طولون کی جانب بڑھے جہاں مسجد ابن طولون ہے اور قریب ہی دیگر مزارات ہیں جن میں مزار سیدی محمد الانور، سیدہ سکینہ اور سیدی علی جعفری مشہور ہیں۔ جامع ابن طولون ایک بادشاہ کی یادگار ہے سن ۲۶۳ ہجری میں یہ مسجد امیر احمد ابن طولون نے تعمیر کرائی تھی اور اس پر ایک سو بیس ہزار دینار خرچ ہوئے تھے۔ دو سال کی مدت میں ۲۶۵ ہجری یعنی ۸۷۹ عیسوی میں مسجد کی تعمیر مکمل ہوئی۔ یہ بات مسجد کے قبلہ رخ کی ایک دیوار میں لگے ہوئے پتھر پر کندہ ہے۔ یاد رہے کہ طولون ترک غلاموں میں سے ایک غلام تھے جو بخارا کے عامل نے خلیفہ مامون الرشید عباسی کو پیش کئے تھے، طولون کے ہاں پیدا ہونے والے بیٹے احمد نے شاہی محل میں پرورش پائی تھی اور بادشاہ کا خاص قرب حاصل کیا تھا، چنانچہ خلیفہ نے اسے فسطاط کا والی/ حاکم مقرر کیا۔ اور یوں ایک غلام زادے کو شہزادگی نصیب ہوئی جو آگے چل کر، امارت و بادشاہت میں بدل گئی۔ اس شہزادے کی وسعت اقتدار نے مصر میں طولونیہ کا خاندان متعارف کرایا جس نے ۲۵۴ھ سے ۲۹۲ھ تک مصر میں حکومت کی، احمد بن طولون نے اپنی کمال فراست سے کام لیتے ہوئے ابتداء عباسی خلیفہ کے گورنر کے طور پر تابعداری جاری رکھی تا آنکہ وہ جلد ہی مصر کی ایک مستقل بالذات حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ تعمیر مسجد کے لئے جس معمار یا مہندس کا انتخاب کیا گیا وہ ایک غیر مسلم تھا جو القبطی سعید بن کاتب الفرغانی کے نام سے معروف ہوا۔

اس عظیم الشان تاریخی مسجد کی ایک بات یہاں زبان زدِ خاص و عام ہے کہ اس میں استعمال ہونے والے پتھر ایسے ہیں کہ آگ لگنے کی صورت میں مسجد کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ جامع ابن طولون کے بارے میں ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ یہ طویل و عریض مسجد تعمیر کے مراحل طے کر کے مکمل ہوئی تو لوگ نماز کے لئے اس میں آنے سے کتراتے تھے، تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ کسی نے یہ بات مشہور کردی ہے کہ اس میں بادشاہ نے مالِ حرام خرچ کیا ہے۔ چنانچہ بادشاہ کو وضاحت کرنا پڑی کہ نہیں صاحب میں نے اس مسجد کی تعمیر پر وہ مال خرچ کیا ہے جو قدرت کی طرف سے ایک مدفون خزانہ ظاہر ہونے پر ملا تھا۔ اس مسجد کی سمت قبلہ کے بارے میں ایک صاحب نے بتایا کہ خود رسول اللہ ﷺ نے خواب میں ابوالعباس احمد ابن طولون کو زیارت سے مشرف کیا اور سمت قبلہ کو درست فرمایا۔ ایوبی دور میں اس مسجد میں قائم مدرسہ ترقی کرتے کرتے ایک جامعہ بن چکا تھا جہاں مذاہب اربعہ کے مطابق فقہ کی تعلیم و تدریس ہوتی تھی اور علم حدیث و طب کے علاوہ دیگر علوم بھی پڑھائے جاتے تھے۔ مسجد کی ظاہری کیفیت سے یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ برس ہا برس سے بند ہو اور صرف ایک گوشہ ہی زیر استعمال ہو۔ ایک وقت تھا جب شاہان عرب و عجم

مصر کے دورے پر آتے تو انہیں اس مسجد میں نماز جمعہ کے لئے اور خطبات کے لئے لایا جاتا۔ مصر کی تین قدیم مساجد میں سے یہ تیسری بڑی مسجد ہے جبکہ قدامت کے اعتبار سے جامع عمرو بن عاص سب سے قدیم ہے کہ یہ ۲۱ ہجری میں سب سے پہلے تعمیر ہوئی۔ جبکہ ۱۶۹ ہجری میں جامع العسکر تعمیر ہوئی جو فوج کے لئے خاص تھی۔

مسجد ابن طولون کے زیر سایہ تھوڑی دیر رکنے کے بعد سیدہ سکینہ اور سیدی محمد الانور رحمہما اللہ کی زیارت کے لئے جانا ہوا جو قریب ہی ہیں۔ سیدہ سکینہ کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہیں ان کی والدہ کا نام رباب تھا۔ جبکہ سید محمد الانور حضرت زید بن الابلج بن امام حسن مجتبیٰ کے صاحبزادے ہیں۔ مصر میں قبرستان بہت طویل وعریض ہیں ان میں قدیم بھی ہیں قدیم تر بھی اور جدید بھی..... اس لئے کہ مصر کی تاریخ قدیم تاریخ ہے چنانچہ پرانے زمانے سے قبرستانوں کی حفاظت کا نظام بھی قائم ہے۔ کئی کئی میل پھیلے ہوئے قبرستانوں کو جہاں پختہ قبریں ہیں دیکھ کر جہاں یہ اچھا لگا کہ مسلمانوں کی تاریخ محفوظ ہے وہیں قبروں کا پختہ نہ کرنے کا فلسفہ بھی سمجھ میں آنے لگا تاکہ شہر قبرستانوں میں نہ بدل جائیں بلکہ قبرستانوں پر شہر بستے اور آباد ہوتے رہیں۔

WOULD YOU LIKE TO KNOW SOMETHING ABOUT ISLAM ?

By : Mohammad M. Ahmed

Really a book that tells you everything about Islam being criticized in the western society.

The book that clears up the misconceptions and misunderstandings about Islam.

The book bridges the gap between Muslims & Non Muslims.

Published by: Crescent Book Inc. P.O.Box 786Wingdale NY 12594-1435 www.crescesnt-books.com

E.mail: info@crescent-books.com